Woodbrooke Series No. 28

THE MEANING OF SUFFERING

By
(Prof. Lootfy Levonian)

رنج و مصیبت کا مطلب

مصنفہ
پروفیسر لطفی لیونیان صاحب
مقیم بیروت

پنجاب ریلیجس بک سوسائٹی
انارکلی لاہور

بار اول — سنہ ۱۹۵۱ء — تعداد ۱۰۰۰

P. R. B. S. Anarkali,
LAHORE.

رنج و مصائب کا مطلب

۱۵ - زندگی میں دُکھ اُٹھانے کا کیا مطلب ہے ۔ دُنیا میں دُکھ اور مصائب کیوں ہیں۔ کیا یہ کسی نیک مقصد کے لئے ہیں ؟

بُرائی اور نظامِ قدرت: - اِس سوال پر غور کرنے کے لیئے ہمیں سب سے پہلے دُکھ اور مُصیبت کو قُدرتی طریقِ عمل کے نقطۂ نظر سے غور کرنا ہے ۔ طبعی دُنیا میں ہم ترتیب اور نظم دیکھنے کی توقع رکھتے ہیں فطری واقعات قوانین کے ماتحت ہیں ۔ اور ہر ایک اچھی بات جو ہمیں فطرت میں نظر آتی ہے ۔ فطری طریقِ عمل میں حُسنِ ترتیب کا نتیجہ ہے ۔ ہم بیج بوتے ہیں اور نمی ۔ ہوا اور دُھوپ کے کیمیاوی تفاعل سے اچھی فصلیں جمع کرتے ہیں۔ پس جس طرح فطری حُسنِ ترتیب کے ذریعے ہمیں فائدے حاصل ہوتے ہیں، تمام فطری نقصان اسی نظام کا نتیجہ ہیں ۔ نظامِ قدرت میں تمام دُکھ اور تکلیف ایسی ہی ضروری ہے جیسے کہ اس کے فائدے اور شادمانی ۔ پانی ایک سیال شے ہونے کی تمام خوبیاں رکھتے ہُوئے ہمارے لیئے ایک بڑی برکت ہے ۔ لیکن ان خوبیوں کے ہوتے ہُوئے یہ ہمیں ڈبو بھی سکتا ہے ۔ یہ ایک باقاعدہ فطری دُنیا ہے ۔ جو ایسے قوانین کے ماتحت ہے جو استقلال سے کام کرتے ہیں ۔ اور ہم قوانین سے یہ توقع نہیں رکھ سکتے کہ وہ صرف مسرت بخش نتائج کے حامل ہیں ۔ جس میں کسی اور بات کو دخل نہیں ۔ ہم اپنی خوشیوں کے لیئے قوانینِ قدرت پر حاوی نہیں ہو سکتے ۔ ہمیں لازم ہے کہ تمام مصائب کو قدرتی طریقِ عمل کی اُسی باضابطہ روشنی میں دیکھیں ۔

جس میں کہ برکتوں کو دیکھتے ہیں۔

۱۴۔ **فطرت غیر مکمل ہے:۔** اس کے علاوہ یہ خیال کرنا کہ خدا نے دُنیا اور کُل کائنات اپنے ایک حکم سے خلق کئے اور کہ اُسے ایک مکمل اور ختم شدہ نظام کے طور پر معرضِ وجود میں لایا۔ خلقت کو اور اُس سے خدا کے تعلق کو غلط تصور کرنا ہے۔ نہ ہی دُنیا ایک نظام کامل ہے۔ اور نہ ہی خدا نے خلقت کو ختم کیا۔ فطرت ایک ختم شدہ شے نہیں ہے۔ یہ ابھی بن رہی ہے۔ خدا کا جہان لاارتقائی ہے۔ نہ کہ تکمیل شدہ فطری واقعات کو مسلسل نا علیت کے طریق عمل کے نتیجہ کے طور پر سمجھنا چاہئے۔ اور ایک نامکمل لیکن نشوونمائی کُل کی حیثیت سے اس کی تعبیر کرنی چاہئے۔ خلق شدہ دُنیا خدا کی مرضی کا محض جزوی طور پر اظہار ہے۔ ابھی خاتمہ نہیں ہُوا۔ خدا موجودہ زمانے میں ابھی تک مختارِ کُل نہیں ہے۔ پردہ جلد ہی ہو جائیگا۔ بُرائی کا صرف یہ مطلب ہے۔ کہ دُنیا ابھی تک نامکمل ہے۔ اس لئے نجات کی حاجتمند۔ اور کہ موجودہ زندگی خدا کے مقصد کا اظہار نہیں کرتی۔ اور اسے پھر سے بنائے جانے کی ضرورت ہے۔ خدا۔ فطرت اور انسان سب چیزوں کو نیا بنانے میں مل کر کام کر رہے ہیں۔

بہت سے ایسے دُکھ اور مصائب ہیں۔ جو قوانینِ فطرت کے بہتر علم اور اُس پر عمل کرنے سے زندگی میں سے مٹائے جا سکتے ہیں۔ بہت سی بیماریوں کی آسمانی عقوبتیں مثلاً طاعون۔ ہیضہ۔ ٹائیفس اور امراضِ متعدی جنہوں نے گذشتہ زمانے میں ملکوں کے ملک تباہ و برباد کر دیئے دُنیا کے بہت سے حصّوں میں قریب قریب بالکل ہی ختم کر دی گئی ہیں بہت سے نئے صلائد (SERUMS) کے استعمال سے

کروڑوں بچوں کی زندگیاں چیچک اور خناق جیسے مرضوں سے محفوظ کی جا چکی ہیں۔ سن کر دینے والی دواؤں کے استعمال نے ممکن کر دیا ہے۔ کہ عمل جراحی بغیر درد کے انجام دیا جا سکے۔ پنسلین کی جدید دریافت سے میدانِ جنگ میں کام کرتے ہوئے ہزاروں انسانوں کی جانیں زہر پھیلانے والی موت سے بچائی جا رہی ہیں۔ اب جسمانی صحت سے متعلق ہمارے پاس کافی علم ہے۔ اگر ہم محض اپنی معاشری اور اقتصادی زندگی کو بہتر طور پر ترتیب دے سکیں۔ اور اپنے علم پر عمل درآمد کرنے لگیں۔ تو دُنیا میں سے بہت سے غیر ضروری دُکھوں اور مصیبتوں کا خاتمہ ہو سکتا ہے۔

سوالِ موت :۔ اسی سلسلہ میں ہمیں موت پر بھی غور کرنا ہے دُنیا میں موت کیوں ہے؟ دو باتیں ہیں جو اس سوال میں ہماری مدد کر سکتی ہیں۔ اوّل تو یہ کہ انسانی زندگی میں گناہ کی سزا کے طور پر موت کے داخلہ کو لعنت خیال کرنا سراسر غلط ہے۔ پیدائش۔ بالیدگی اور موت اُسی ایک نظام کے مطابق مظہرِ فطری ہیں۔ ہم پیدا ہوتے۔ بڑھتے اور مر جاتے ہیں۔ ایک عقیدہ یہ بھی ہے کہ اخلاقی بُرائی یعنی گناہ وقت کے لحاظ سے پہلے آیا۔ اور بعد میں اِس میں طبعی گُنَہ کا انسانی خطا کی سزا کے طور پر اضافہ ہوا۔ موت اور ہمارے تمام رنج و آلام آدمی کی پہلی نافرمانی کا پھل ہیں۔ لیکن یہ درست نظام کی کایا پلٹ ہے۔ فطری اور طبعی بُرائی گُناہ سے پہلے ہی دُنیا میں کثرت سے تھی۔ اس کے علاوہ درد۔ بیماری اور موت ہر ایک جاندار مخلوق کا حصہ تھا۔ موت اجسام کی ساخت اور نسل پیدا کرنے کے عمل پر دلالت کرتی ہے۔ یہ بُرائیاں تو طبعی دُنیا کے نظام میں ہیں۔ زندگی ہمیشہ درد کے اثر کو قبول کرتی ہے۔ اور موت اِس فطری عنصر کا نامیاتی یا ترکیبی

عمل ہے +

۱۸ - لیکن ضرور ہے ۔کہ ہم اِس معاملے پر رُوح کے نقطۂ نظر سے بھی غور کریں ۔موت انسانی حیات کا خاتمہ نہیں ہے ۔اگر حیاتِ انسانی کا منتہائے مقصود قبر ہی ہوتا ۔تو ہماری حالت تمام خلقت سے زیادہ افسوسناک ہوتی ۔موت انسانی زندگی کو ختم کرنے کے لئے نہیں ہے ۔ یہ زندگی کے لُطف کو دوبالا کرنے کے لئے ہے ۔موت ہماری زندگی کی آخری منزل نہیں ہے ۔بلکہ ایک زیادہ پُرلُطف زندگی کا نقطۂ آغاز ۔ہماری بڑی عمیق آرزوئیں اور تمنائیں ہیں جن کے پُورا ہونے کے لئے ابدیّت چاہیئے ۔ ہمارے انسانی رفاقت کے ایسے بندھن ہیں ۔جو موت سے جُدا نہیں کئے جاسکتے ۔موت زندگی کا خاتمہ نہیں اور نہ ہی یہ خُدا کی طرف سے سزا ہے +

دُکھ اور بُرائی :- تو بھی ہمیں یہ ماننا پڑیگا ۔کہ چند ایک طبعی بُرائیاں ہیں ۔جن کو ہم سمجھ نہیں سکتے ۔یا جن کی ہم تشریح نہیں کرسکتے ۔ ہماری نگاہ محدُود ہے اور ہمارا علم نا تمام ۔لیکن اتنا تو یقینی ہے ۔کہ تمام دُکھ نری بُرائی ہی نہیں ۔جسمانی ترقی میں دُکھ ایک بہت ضرُوری اور مفید کام کرتا ہے ۔یہ کچھ انسدادی اور اصلاحی ہے ۔مثال کے طور پر میرے سردرد اور بخار کا احساس میرے بدن میں آنے والی تکلیف کے متعلق مجھے آگاہ کرتا ہے ۔اور مجھے مجبُور کرتا ہے ۔کہ اس کے روکنے کے لئے ضروری قدم اُٹھاؤں ۔سب سے زیادہ خطرناک وہ بیماریاں ہیں ۔جو ہمارے بدن میں اصلی بے چینی پیدا نہیں کرتیں ۔اگر ہم کو درد کا احساس ہوتا ۔تو ہم اُن کی ترقی کو روک سکتے تھے +

علاوہ ازیں دُکھ اور تکلیف نہ صرف فطری قدروقیمت ہی رکھتے ہیں

بلکہ زندگی کے معاشرتی اور اخلاقی حلقوں میں بھی اس کی بڑی قیمت ہے
وہ آدمیوں کو معاشرتی طور پر بہتر بننے اور خود ترقی کرنے کے لئے ایڑ لگاتے
ہیں اور آگے بڑھنے کے لئے تحریک ہیں۔ تکلیف اور دُکھ سے مقابلہ کرنے
کی خواہش نے بہت سی طبّی دریافتوں اور معاشرتی اصلاحوں کا سبب
مہیا کیا ہے۔ اس کے علاوہ دُکھ کا چال چلن پر ایک خاص اثر ہوتا ہے ۔
جس سے یہ منجھ کر صاف ہو جاتا ہے۔ یہ ہمارے جذبات کو پاکیزہ بناتا اور اخلاقی رگ کو جلا
دیتا ہے۔ اور مضبوط کرتا ہے۔ اپنی اخلاقی ترقی میں ہمیں رنج و تکلیف کی ضرورت
ہے۔ دُکھ اور تکلیف کی قیمت معاشرتی تعلقات میں بھی بہت زیادہ ہے۔
یہ آدمی کی ہمدردی کو متوجہ کرتی اور بہادری اور قربانی کے جذبہ کو اُبھارتی اور
بیدار کرتی ہے۔ عام مصائب کے نزاعی عنصروں کو اکٹھا کر کے اُنہیں آپس
کی دوستی کے تار سے باندھ دیتی ہیں۔

نیابتی دُکھ اُٹھانا: — لیکن دُکھ اُٹھانے کا بلند ترین نمونہ اُن
کی زندگیوں میں دیکھا جا سکتا ہے۔ جو خود بالکل آزاد ہوں۔ تو بھی دُوسروں
کی تکلیف کو ہلکا کرنے کی غرض سے خود اپنی مرضی سے اپنے اُوپر دُکھ لے لیتے
ہیں۔ ایک مامتا کی ماری ماں اپنی نیند اور آرام کو بیمار بچّے کی خدمت کرنے
کے لئے قربان کر دیتی ہے۔ ایک غریب بیوہ اپنی روزانہ روٹی میں سے کچھ
بچا لیتی ہے۔ تاکہ گرد و نواح کے بھُوکوں کو کھلا سکے۔ ایک اعلیٰ طبیب
اپنے آرام کو غیر مہذب اور وحشی لوگوں کی خدمت کرنے کے لئے قربان کرتا
ہے۔ کریم النفس نوجوان عورتیں اپنے گھروں کو چھوڑ کر دُور دراز مُلکوں میں
کوڑھی خانوں میں نرسیں بن کر اور خود کو اس بیماری کے لگ جانے کے خطرے
میں ڈال کر اُن کی خدمت کرنے کو جاتی ہیں۔ ایک کامیاب تاجر بہت زیادہ

دولت حاصل کرنے کی اُمید سے ہاتھ اُٹھا کر شہر کی گندی اور تاریک گلیوں میں جا کر رہتا ہے۔ تاکہ لوگوں کی حالت کو سُدھارے۔ اور اس سے بھی زیادہ عالی ظرفانہ اُن لوگوں کا دُکھ سہنا ہے۔ جو خود بالکل بے گناہ ہوتے ہُوئے اپنے دُشمن کی خاطر دُکھ اُٹھاتے ہیں۔ اِس قسم کی قربانی ایک سپاہی کرتا ہے۔ جو ایک گِرے ہُوئے اور زخمی دُشمن کو دیکھ کر اپنی بوتل کے پانی کی آخری بُوندیں اُسے دے دیتا ہے۔ تاکہ وہ اپنی پیاس بُجھا سکے۔ یا ایک حبشی غلام جو اپنے سفید آقا کو نیچے دریا میں ڈوب جانے کے خطرے میں دیکھ کر اُس کی جان بچانے کے لئے خود کو پُل پر سے نیچے گرا دیتا ہے۔ مَیں ایک ایسے جرّاح کو جانتا ہُوں۔ جس نے ایک ایسے مریض پر ایک بھاری عمل جراحی کیا۔ جس نے چند سال پیشتر اُس کے بھائی کو قتل کر دیا تھا۔ اُس نے اُس پر عمل جراحی کر کے تندرست گھر بھیج دیا۔ یہ ایسی مثالیں ہیں۔ جو دُکھ اُٹھانے اور قُربانی کو لعنت نہیں برکت اور تکلیف نہیں بلکہ زندگی کا تاج بنا دیتی ہے۔

اختتامی الفاظ۔ تکلیف اُٹھانے کا کیا مطلب ہے۔ اِس سوال کا جواب اُس انداز پر منحصر ہوگا جس سے ہم اِسے دیکھیں گے۔ اگر ہم اِس کو ایک بوجھ سمجھیں گے۔ تو اِس سے بے چینی محسُوس کر کے اِس سے خلاصی حاصل کرنا چاہینگے۔ اگر ہم اِسے ناگزیر اور وبالِ جان تصور کرینگے۔ تو ہم ایک رواقی فلسفی کی سی بے پرواہی سے اِس کا مقابلہ کرینگے۔ لیکن اگر ہم اِس پر شخصی تادیب اور زندگی کو زیادہ پُرلطف بنانے کے لئے نگاہ کرینگے۔ تو اس کا سامنا خوشدلی سے کرینگے۔ یہاں تک کہ موت بھی اپنا ڈنگ کھو دیگی۔ اگر تکلیف ہماری بیوقوفی اور گنہگار فعل کا نتیجہ ہے۔ تو ہمیں

اِس کا افسوس ہوگا۔ لیکن اگر ہم محبت سے دوسروں کی خطاؤں کو اپنے اُوپر لے لیتے ہیں۔ اور
اس کو رضاکارانہ طور پر خود ہی اپنے اُوپر لے لیتے ہیں۔ تو اسی میں فخر محسوس
کرینگے۔ انسانی زندگی کی سب سے بلند پایہ خوشیوں میں سے ایک یہ ہے کہ
ہم اوروں کی خاطر دُکھ سہتے ہیں۔ تاکہ اُن کا بوجھ ہلکا ہو جائے۔ محرومِ محبت
اور بے مہر لوگوں سے محبت کریں۔ تاکہ وہ دلکش اور دلآویز بن جائیں۔
اِس سے قدرتی طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے۔ کہ خُدا بُرائی پر کس طرح
غالب آیا؟

خُدا اور بُرائی:۔ اگر خُدا نیک اور قادرِ مُطلق ہے۔ تو بُرائی ابدی
نہیں ہو سکتی۔ اس پر غالب آنا اور اس کو مِٹا ڈالنا ضروری ہے۔ بُرائی
خُدا کی مرضی میں رُکاوٹ ہے۔ اور خُدا کے مقصد کے خلاف بغاوت۔
پس کسی نہ کسی طرح اس کا خاتمہ کرنا ضروری ہے۔ بعض مذاہب کا پختہ یقین
ہے۔ کہ انجام کار بُرائی مغلوب کی جائیگی۔ لیکن خُدا یہ کس طرح کریگا؟ اِس
سوال پر تعلیمیں مختلف ہیں۔

۲۱۔ جبر و تعدی سے نہیں:۔ عہدِ عتیق کی کچھ کتابوں میں یہوواہ
کو ایک جنگجو ہستی دکھایا گیا ہے "یہوواہ جنگ کرنے والا ہے" اصل میں
تو ہمیں ایک کتاب کے متعلق بتایا گیا ہے۔ جو یہوواہ کی جنگوں کی کتاب
کہلاتی ہے۔ یہوواہ اپنے دُشمنوں کے خلاف جنگ کرتا ہے۔ "وہ عمالیق
کا نام و نشان دُنیا سے بالکل مِٹا دیگا" (خروج ۱۷: ۱۴) وہ "اُن کو لوہے
کے عصا سے توڑیگا۔ کمہار کے برتن کی طرح وہ اُن کو چکنا چور کر ڈالیگا"
(زبور ۲: ۹) خُدا اپنے مسیح سے کہتا ہے۔ "تو میرے دہنے ہاتھ بیٹھ۔
جب تک کہ میں تیرے دُشمنوں کو تیرے پاؤں کی چوکی نہ کر دُوں۔"

(زبور ۱۰:۱) ہم الہامی نوشتوں میں پڑھتے ہیں کہ خدا کہتا ہے "میں نے اُن کو اپنے قہر میں لتاڑا۔ اور اپنے جوش میں اُن کو رَوندا۔ اور اُن کا خون میرے لباس پر چھڑکا گیا۔ اور میں نے اپنے سب کپڑوں کو آلودہ کیا۔ کیونکہ انتقام کا دن میرے دل میں ہے"۔ (یسعیاہ ۶۳: ۳ و ۴)

بعد کی کشفی کتب میں (یعنی حنوک کی کتاب) جوبلیوں کی کتاب۔ اور بارہ بزرگوں کا عہد نامہ وغیرہ۔ ہم اِس خیال کو پورے عروج پر پاتے ہیں۔ ایسا کہ خدا پورے زور کے ساتھ بہت سے فرشتوں کی فوج کے ہمراہ آئیگا۔ بدی کی طاقتوں کو مِٹا ڈالیگا۔ اور دُنیا میں ازسرِ نو اپنی بادشاہت قائم کریگا۔ ان میں ہم بدی کی تمام طاقتوں کے اُوپر جن کا سرغنہ ابلیس ہے۔ خداوند کی طرف سے انتقام۔ قہر اور فتح کا تصور پاتے ہیں "خداوند نے میکائیل سے کہا۔ جا سیمزا اور اُسکے ساتھیوں کو باندھ لے۔ اُنہیں دُنیا کی وادیوں میں ستر پُشت اور اُن کی تکمیل کے دن تک جب تک قہرِ الٰہی ابد تک پختہ ہوتا رہیگا مضبوطی سے باندھ لے۔ ہر ایک بُرائی کو صفحۂ دُنیا پر سے مِٹا ڈال۔ اور ہر ایک بُرے کام کا خاتمہ کر دے (حنوک کی کتاب ۱۰: ۱۱ الف)

۲۲۔ اِنہی خیالات کا عکس عہدِ جدید کے کچھ نوشتوں میں بھی ہے۔ جس میں جہنم کا بیان ہے جس کی آگ کبھی نہیں بجھتی۔ جہاں دانتوں کا پیسنا ہوگا۔ اور بُرے لوگوں کے لئے خوفناک تکلیف۔ یہ ایک ایسا خیال ہے جسے بہت سے مناّدوں نے گناہگاروں کو جگانے اور اُنہیں توبہ کی طرف رجوع دِلانے کے لئے استعمال کیا ہے۔

اِس خیال پر تنقید:۔ گُناہ کی اہمیت اور اُس کے خوفناک

نتائج ظاہر کرنے کے یہ خیال مفید تو ہے۔ لیکن یہ کچھ غلط تصوّرات پر مبنی ہے۔ اوّل تو یہ بُرائی کو ایسی خارجی طاقت کے طور پر ظاہر کرتا ہے۔ جس سے جنگ کر کے اُسے مٹا ڈالنا ہے۔ یہ خیال کہ بُرائی ایک خارجی بڑی طاقت ہے جو خُدا کے خلاف برسرِ پیکار ہے۔ اصل میں زرتشتی مذہب کا خیال ہے (خیالِ ثنویت) جس سے یہ یہودیوں میں سرایت کر گیا۔ اور یہودیوں سے اور مذاہب میں۔ مسیح نے اِس خیال کی درستی میں بہت حصّہ لیا۔ جب اُس نے یہ تعلیم دی کہ بدی یہاں یا وہاں نہیں بلکہ تمہارے اندر ہے۔ اُس نے کہا کہ "انسان کے اندر سے یعنی دل سے ہی بُرے خیالات نکلتے ہیں۔ بُری باتیں اندر سے ہی نکلتی اور آدمی کو ناپاک کرتی ہیں۔" بُرائی لازمی طور پر خود لائی ہے یہ آدمی کی ذات میں ہے۔ اِس لئے یہ کوئی ایسی چیز نہیں جو خارجی طاقت یا دباؤ سے مغلوب کی جائے یا مٹا ڈالی جائے۔ دباؤ یا زور انسان کو مار سکتا ہے۔ پر اُس کی مرضی کو جھکا نہیں سکتا۔

اِس تصوّر نے سزا کو انصاف کی تکمیل۔ اور دُکھ اور تکلیف کو خُدا کے عدل کا فرض ادا کرنے کے خیال میں غلطی کھائی ہے۔ اگر انصاف بُرائی کرنے والے پر دُکھ بھیجنا ہی ہے۔ تو یہ کوئی خوبی نہیں۔ ہمیشہ انتقامی سزا یا تو لااخلاقی ہوتی ہے۔ یا بد اخلاقی۔ ایک انسان میں اخلاقی بُرائی ہے۔ اور تم اُس میں جسمانی بُرائی کا بھی اضافہ کر دیتے ہو۔ ایسا کرنے کا کیا فائدہ۔ یہ خیال کہ بُرائی کے مطابق ایذا دینی چاہیے بالکل بے بُنیاد ہے۔

۲۳ - لیکن یہ خیال سب سے زیادہ فطرت کے غلط تصوّر پر مبنی ہے۔ اگر ہم خُدا کو اصل میں ایک ظالم یا مطلق العنان حاکم سمجھیں۔ جو اپنی مرضی کے مطابق عمل کرتا اور جس میں اخلاقی اصول کا کوئی احساس یا

محبت اور رحم کا کوئی جذبہ نہیں ہے۔ تو وہ اُن لوگوں پر جو اُس کے مقصد کا مقابلہ کرتے ہیں۔ تکلیف بھیج کر اطمینان حاصل کرے اور آخرکار اُن کو بالکل مٹا ڈالے۔ لیکن اگر ہم خدا کو سب آدمیوں کا باپ سوچتے ہیں اور آسمانی باپ جو نیکوں اور بدوں دونو پر مینہ برساتا اور سورج چمکاتا ہے۔ تو وہ بُرے کام کرنے والوں پر تکلیف نازل کر کے کس طرح اطمینان پا سکتا ہے۔ کیا ایک فی الواقعی شفیق باپ اپنے نافرمان بیٹے کو سخت سزا کا دُکھ اُٹھاتے دیکھ کر مطمئن ہو سکتا ہے۔ اس بھیمی طاقت کا استعمال خُدا کی فطرت کے خلاف ہے۔ جس کا اُس نے اپنی تعلیم اور زندگی میں اظہار کیا ہے۔

۳۴۔ **مسیح اور بُرائی**:۔ اگر جبر نہیں تو پھر خدا کس طرح بُرائی پر غالب آتا ہے۔ اس سوال پر مسیح کی تعلیم بالکل صاف اور بہت معنی خیز ہے۔ بُرائی بُروں کو مٹا ڈالنے سے نہیں بلکہ اُن کو بدل دینے سے مغلوب ہوتی ہے۔ اس سوال پر جو چیز مسیح کی تعلیم کو اور لوگوں کی تعلیم سے ممیز کرتی ہے۔ وہ یہ حقیقت ہے۔ کہ مسیح بُرائی کو غیر معترض نہیں۔ بلکہ ایک بُری ضمیر خیال کرتا ہے۔ اور اُس کا مقصد گنہگار کی رُوح پر اثر ڈالنا اور اُس کو نیکی میں تبدیل کرنا ہے۔ یہ کس طرح کیا جائیگا؟ یہ محبت کے مکاشفہ سے عمل میں آئیگا۔ ایسی پاکیزہ اور شدید حس کی طرف سے کوئی دل بھی غیر متاثر نہ رہ سکیگا۔ مسیح کی صلیب اور اُس کی ذات کا اصلی مطلب یہاں نظر آتا ہے۔ کہ خدا آدمیوں کے احوال سے بے پرواہ نہیں ہے۔ برعکس اس کے اُس نے خود کو آدمیوں کی نجات کے لئے دُنیا میں جھونک دیا۔ الوہیت مسیح کی تعلیم کی اہمیت صرف مسیح کی ذات کی فوق الانسانی خوبیوں کو محفوظ کرنا ہی نہیں بلکہ لازمی طور پر انسان کی مخلصی کے لئے خُدا کے

فضل کا اظہار بھی ہے۔ مسیح میں ہم نہ صرف ایک آدمی کو خُدا تک پہنچتے ہوئے دیکھتے ہیں۔ بلکہ خُدا کو انسان تک پہنچتے ہُوئے بھی پاتے ہیں۔ اور اگر خُدا محبت کا خُدا ہے۔ تو اُس کے لئے اِس سے زیادہ اور کیا قدرتی بات ہو سکتی ہے۔ کہ وہ دُنیا میں آئے۔ انسان کے دُکھوں میں حصہ لے اور خود کو اُس کی نجات کے لئے دے دے۔ یہ حکم دینے یا کسی پیغامبر کے ذریعے دھمکی دینے سے کہیں زیادہ پُرعظمت اور پُروقار ہے۔ خُدا نے جہان سے ایسی محبت رکھی کہ وہ خود یسُوع مسیح میں ہوکر آدمیوں کی نجات کے لئے دُنیا میں آیا۔ مسیح کی صلیب میں ہم خُدا کو گُناہگار انسان کے ہاتھوں دُکھ اُٹھاتے ہُوئے بھی اپنے صبر اور محبت سے بُرائی پر غالب آتے دیکھتے ہیں۔ مسیح کی صلیب تو ایک طرف گو آدمیوں کی بُرائی کو بے نقاب کرتی ہے۔ تو بھی دُوسری طرف گناہ گاروں کے لئے خُدا کی محبت کا انکشاف کرتی ہے ایسی محبت جو اُن کو چھوڑ نہیں سکتی محبت قربانی کی راہ سے کام کرتی ہے۔ ایسی قربانی نہیں جو غُصہ ٹھنڈا کرنے کے لئے ہو۔ بلکہ یہ محبت کا ماحصل ہے ہم جبکہ گنہگار ہی تھے۔ تو مسیح نے خود کو ہمارے لئے دے دیا۔ صلیب پر مسیح کی دُعا انہیں معاف کر ایسی ہے۔ جو ہم سب کے لئے ہے۔ کلوری پر خُدا کی محبت سب آدمیوں پر مفصول کے طور پر ظاہر ہُوئی۔ اور یہ عمل نہیں ہو سکتی۔ جب تک ہر ایک شخص اِس کا جواب توبہ سے نہ دے۔

۲۵۔ کیا خُدا بیچ میں آتا ہے: لوگ عام طور پر سوال کرتے ہیں۔ کہ خُدا کیوں نہیں بیچ میں آتا۔ جواب صاف ہے۔ یہ نہیں کہ خُدا بیچ میں نہیں آتا۔ پر یہ کہ اُس کی مداخلت غیر مسلسل اور بے قاعدہ نہیں ہے۔ وہ مداخلت جو ایسے لوگ چاہتے ہیں۔ جن کا سوال مثال کے طور پر یہ ہے۔

کہ خُدا جنگ کیوں بند نہیں کرتا ایسی مداخلت ہے۔ جو خارجی مطلق العنان
ایک خاص نقطہ پر کرتا ہے۔ گویا خُدا نے دُنیا کو بڑی بھاری کل کے طور پر
پیدا کیا ہے۔ اور وہ خود اس سے اُوپر باہر کھڑا ہُوا ہے۔ اور اُس سے
کہا جاتا ہے کہ اِس کل کو دُرست کرے۔ یہ خُدا کا ایسا تصوّر ہے۔ گویا خُدا
یسُوع مسیح کا باپ نہیں۔ پر ایک غائب باش زمیندار ہے۔ یہ سچ ہے۔
کہ خُدا وقتاً فوقتاً اور بے قاعدگی سے مداخلت نہیں کرتا۔ یا آدمی پر
باہر سے دباؤ ڈالتا ہے۔ لیکن اس سے کچھ اور زیادہ ہے۔ محبت صرف
مُنتظر رہنے پر ہی قناعت نہیں کرتی۔ خُدا ارسطو کا غیر متاثر مبدا نہیں
ہے۔ خُدا وہ باپ ہے جو آدمیوں کو اپنی محبت میں بُلا کر دُنیا میں کمیاب
ہوتا ہے۔ محبت صرف خاموش انتظار نہیں کرتی۔ بلکہ لگاتار کام کرتی
رہتی ہے۔ یسُوع نے کہا "میرا باپ اب تک کام کرتا ہے۔ اور میں بھی کام
کرتا ہُوں"۔ خارجی دباؤ سے نہیں۔ بلکہ باطنی مکاشفہ سے۔ خُدا رُوح
کے ذریعے اور انسان کے دِل اور دماغ اور ضمیر کے ذریعے ایسی محبت سے کام
کرتا ہے۔ جو آدمی کو چھوڑ نہیں سکتا۔

خُدا جو یسُوع مسیحِ مصلوب کا باپ ہے۔ تمام دُنیا کا بوجھ اُٹھاتا ہے ایسا
نہیں جو دُنیا سے علیحدہ ہو کر دُور کھڑا ہے۔ بلکہ ایسا جو اِس میں داخل ہوتا
ہے۔ وہ ایسا نہیں جو تمام مخلوق کے درد میں کراہنے کی پُکار سے متاثر نہیں ہوتا
لیکن وہ اُن کے ساتھ ایک ہے۔ یہ ضرور کسی نہ کسی طور سے سچ ہے۔ کہ مسیح
کی صلیب زمانے کی انتہا تک خُدا کی صلیب ہے۔

۲۶۔ قدیم یونانی فلسفیوں نے خُدا کو اتنا ماورائے ادراک سمجھا۔ کہ اُنہوں
نے بیش قیاسی سے اُسے دُکھ اُٹھانے کے ناقابل خیال کیا۔ اُن کے تصوّر میں

خُدا ناگذار اور بغیر کسی احساس کے ہے۔ یہ وہ جھلک نہیں ہے جو ہمیں مسیح کے ذریعے نظر آتی ہے۔ مسیح میں ہم ایسا خُدا دیکھتے ہیں۔ جو دُکھ اُٹھانے کے لائق ہے۔ اور دُکھ اُٹھاتا ہے۔ دُنیا کا صحیح تصور ایسا نہیں جس میں اُوپر تو ایک غیر متاثر آسمان ہو۔ اور نیچے گنہگار اور دُکھی دُنیا۔ لیکن ایک ایسا خُدا جو دُنیا میں ہے۔ اور انسان کے ساتھ اُس کی نجات کے لئے دُکھ اُٹھاتا ہے۔ خُدا کا مافوق الطبعی تصور یعنی وہ ہستی جو احساس سے خالی ہے۔ کوئی مذہبی قیمت نہیں رکھتا۔ مسیح کی زندگی اور تعلیم میں خاص کر اُس کی صلیب میں ہم خُدا کو اپنی محبت سے مجبور ہو کر انسان کے ساتھ دُکھ اُٹھانے میں شریک ہوتے ہُوئے دیکھتے ہیں۔ خُدا کو ضرور ہے کہ اُس دُنیوی طبقہ میں داخل ہو جہاں بدی نے اُس کو مقابلہ کے لئے للکارا تھا۔ اور فتح حاصل کرے۔ خُدا کی حقیقی اور سچی تعلیم یہ نہیں ہے۔ کہ وہ راستباز ہے یا رحیم ہے۔ لیکن یہ کہ وہ نجات دینے والا ہے۔ خُدا کے بارے میں مسیح کی تعلیم کا کلیدی لفظ نجات ہے۔ ہم کسی ایسے خُدا کے رحم پر نہیں ہیں۔ جو ہماری تکلیف اور دُکھ سے بے پرواہ ہو۔ لیکن اُس آسمانی باپ کی حفاظت میں ہیں۔ جو ہم سے محبت رکھتا اور ہمارے ساتھ ہے۔ خُدا اور آدمی کے بارے میں مسیح کی زندگی اور تعلیم کا یہی مطلب ہے۔

۲۷۔ اختتامی خیالات:۔ اس سبق کا ہمارے زمانے کے مسائل سے کیا تعلق ہے؟ کیا اس کا کوئی اساسی تعلق ہے۔ یا یہ محض نظریاتی قیاس آرائی ہے؟ میرا یقین ہے کہ اس کا ضرور کوئی نہ کوئی تعلق ہے اور بہت نزدیکی۔ دُنیا بدی اور دُکھ میں اُبل رہی ہے۔ اور دُنیا میں اہم ترین مسئلہ یہ ہے کہ کس طرح بدی پر غلبہ پائیں۔ خوفناک ظلم اور بدتہذیبیاں دیکھ کر ہم جذبۂ انتقام سے بھر جاتے ہیں۔ لیکن اگر ہمارے دِل انتقام سے پٹ جاتے اور اُس سے

مغلوب ہو جاتے ہیں۔ تو کیا اِس کا نتیجہ صُلح اور آشتی ہوگا؟ کیا نفرت کا نتیجہ محبّت۔ قتل کا زندگی اور تشدد کا آزادی ہوگا۔ پھر اِس کا کیا مطلب ہے۔ کہ "نیکی سے بدی پر غالب آؤ۔ جو تمہیں دُکھ دیتے ہیں اُن کے لئے برکت چاہو" اور اس سے بھی زیادہ اِس کا کہ "اپنے دُشمنوں سے محبت رکھو"؟ شاید پہلے ہم باطنی طور سے بدی پر غالب آئیں۔ اِس سے بیشتر کہ یہ دُوسروں کی زندگی میں مغلوب کی جا سکے۔ باہر کی دُنیا میں صُلح اور اطمینان قائم کرنے سے بیشتر ضرُور ہے۔ کہ ہم اپنے دِلوں میں صُلح اور آشتی پیدا کریں۔ مسیح نے اپنی جسمانی زندگی کے اختتام پر کہا۔ کہ "میں دُنیا پر غالب آیا ہُوں"۔ اگر ہمارے خیالات بھی اُس کی طرح ہیں۔ اور اُس کے حُکموں پر چلتے ہیں۔ تو پہلے ہم اپنے باطن کی چھوٹی سی دُنیا پر غالب آئیں اور پھر اپنے گرد و پیش کی بڑی اور وسیع دُنیا پر۔ خودی اور بُرائی پر فتح حاصل کرنے کا یہی درُست طریقہ ہے *

پی۔آر۔بی۔ایس۔ پریس لاہور میں باہتمام پادری جے۔ڈی۔ چندو۔ سیکرٹری پنجاب
ریلیجس بُک سوسائٹی۔ انارکلی لاہور چھپ کر شائع ہوئی